لکھنؤ والے

تحریر: زیبا صدیقی

اگست ۱۹۹۰ء میں کویت پر غاصبانہ عراقی قبضہ کے نتیجے میں بالخصوص برصغیر میں کئی کہانیوں نے جنم لیا جن میں ان مسائل پر بات کی گئی جو اس بلا جواز کاروائی کے نتیجے میں عمل میں آئے۔ زیبا صدیقی کے قلم سے لکھی گئی کہانی ''لکھنؤ والے،، انہی کہانیوں میں سے ایک ہے جبکا انداز اگرچہ کے سادہ ہے لیکن انسانی جذبوں کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے حالات کیسے بدل جاتے ہیں۔ ابھی کل ہی آفس میں کلام اپنے سینئر انجینئر سے کہہ رہا تھا کہ وہ کل نئے پروجیکٹ کے کاغذات مکمل کر لے گا۔ آج صبح وہ گھڑی کے الارم سے پہلے ہی توپوں اور گولیوں کی گھن گرج سے اٹھ گیا تھا۔ اس نے فلیٹ کی بالکونی سے باہر جھانک کر دیکھا، ہر طرف عراقی فوجیں نظر آرہی تھیں۔ ظالموں نے ایک دن میں پورے ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کی بیوی ناہید ابھی تک سو رہی تھی میٹھی نیند، جس پر گولیوں کی آواز تک کوئی اثر نہیں کر رہی تھی۔ وہ صرف ایک ہفتہ قبل ہی کویت آئی تھی شادی کے فوراً بعد۔ اس کو اٹھانے کے لئے کلام کو اسے جھنجھوڑنا پڑا۔

کیا ہے، سونے دو۔ وہ منمنائی، لیکن اب گولیوں کی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

کویت پر عراقی فوج کا قبضہ ہو گیا ہے، کلام نے اسے بتایا

یا اللہ یہ کیا ہوا، وہ ایک دم گھبرا گئی۔ ایک آزاد اور پُر امن ملک پر ایسی قیامت۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ کوئی ان کا دروازہ پیٹنے لگا۔ وہ ڈر کر کلام سے چمٹ گئی۔ کلام بھی گھبرا گیا، لیکن دروازہ تو کھولنا پڑے گا۔ عراقی فوجی ہونگے، وحشی ہیں، وہ دروازہ توڑ کر بھی اندر آسکتے ہیں۔ کلام نے دروازہ کھول دیا۔ سہمی سہمی ناہید بھی اس کے پیچھے آگئی تھی۔ سامنے ایک ملٹری آفیسر کھڑا تھا اس کے ساتھ کچھ سپاہی بھی تھے۔

اوہ، ہندی؟ وہ کلام کو دیکھ کر بولا

نہیں، بنگلہ دیشی، کلام نے جواب دیا۔ ان لوگوں نے فلیٹ کی تلاشی لی اور وہاں سے چلے گئے۔ کویت پر عراق کا قبضہ ہوئے تین ہفتے ہو گئے تھے لوگوں کو کویت چھوڑ کر اپنے اپنے وطن جانے کی اجازت تھی، جس کے نتیجے میں لوگوں نے اپنے اپنے ملک جانا شروع کر دیا تھا، زیادہ تر لوگ کاروں اور دیگر زمینی ذرائع سے جا رہے تھے، فضل مکانی کرنے والوں میں سب ہی تھے، ہندوستانی، پاکستانی، بنگلہ دیشی اور آس پاس کے ملکوں کے بہت سے لوگ، کویت نے کتنے ہی ملک کے لوگوں کو روزگار فراہم کر رکھا تھا۔

کلام کے پاس زیادہ کیش نہیں تھا۔ تنخواہ، پیسے سب بینک میں تھے اور بینک وغیرہ سب بند تھے۔ اسے فی الحال جو ضرورت تھی وہ کار کے لئے پیٹرول اور راستے میں کھانے پینے اور قیام کے لئے ہوٹل کی ادائیگی کے لئے کچھ پیسے۔ ڈھاکہ کے لئے زمین کے راستے بہت لمبا سفر تھا۔ عراق، ایران، پاکستان اور پھر ہندوستان سے ہوتے ہوئے ڈھاکہ پہنچنا تھا۔ اس تصور ہی سے کلام لرز جاتا لیکن سفر تو کرنا ہے۔ عراقیوں نے بیٹھے بٹھائے پُر امن ملک کے پُر امن شہریوں کو عجیب امتحان میں ڈال دیا تھا۔

اگلی صبح وہ ناہید کو لے کر کار کے ذریعے کویت سے ڈھاکہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس کی پہلی منزل عراق سے ہوتے ہوئے ایران تھی۔ ایران کا بارڈر کراس کرنے میں اسے تین دن لگ گئے۔ ہزاروں لوگ وہاں جمع تھے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا، ایسے دن پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اسے کار کے سفر میں ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا، وہ کافی تھک چکا تھا اور ناہید بھی بری طرح نڈھال تھی۔ جب وہ پاکستان سے ہوتے ہوئے ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوئے تو ان کے پاس بہت کم پیسے بچے تھے۔ ابھی تو بہت لمبا سفر باقی ہے۔ پورا یوپی، بہار اور بنگال کراس کر کے ڈھاکہ پہنچنا ہے، پیٹرول کا خرچہ ہی پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ کیسے کام چلے گا، کلام نے ناہید سے کہا۔

یہ میر کے جھمکے ہیں، ناہید نے کہا۔ کہیں انہیں بیچنے کی کوشش کیجئے، اتنے پیسے تو مل ہی جائیں گے کہ ہم ڈھاکہ پہنچ جائیں۔ کلام کچھ نہ بولا، بس مسکرا کر ناہید کو دیکھتا رہا جس کی آنکھوں میں تھکن اور اداسی کے ملے جلے آثار نمایاں دکھائی دیتے تھے۔ کلام بھی جانتا تھا کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ وہ جھمکے اگر اس نے دلائے ہوتے تو اس کو اتنا افسوس نہ ہوتا وہ اس کی ماں کی نشانی تھے جو وہ اپنی بہو کے لئے چھوڑ گئیں تھیں، شاید ناہید بھی اسی لئے افسردہ تھی، اسے یہ جھمکے عزیز تھے جنہیں وہ ہر وقت پہنے رکھتی تھی۔

ماجد اب باقاعدہ ناہید کے جھمکوں کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کی چور نظروں کو کلام نے بھی محسوس کیا۔ اس طرح جھمکے پہن کر سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے، ماجد انہیں کہہ رہا تھا، ان علاقوں میں آوارہ لڑکے گھومتے رہتے ہیں جن کا ذریعہ معاش ان ہی علاقوں میں راہزنی کی وارداتیں ہیں، آپ انہیں اتار کر کار میں کہیں رکھ دیں مجھے تو اس وقت تم ہی سے خطرہ لگ رہا ہے، ناہید من ہی من میں بڑبڑائی۔

کلام گذشتہ آٹھ گھنٹوں سے مسلسل کار چلا رہا تھا۔ شام ڈھل چکی تھی اور وہ لکھنؤ میں داخل ہو رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ شہر کے اندر نہیں بلکہ بیرون شہر قطار در قطار چیڑ کے درختوں کے آس پاس کہیں کار روک کر اس میں رات گزاریں گے۔ شہر کی پُر رونق سڑکوں پر ایسا ممکن نہیں اپنے بجٹ کے مطابق ہوٹل وغیرہ میں ٹھہرنے سے جتنا بچا جائے اچھا ہے وگرنہ ڈھاکہ تک پہنچنا ممکن نہیں رہے گا۔ اس کے پاس ۲۱ کیرٹ گولڈ کے جھمکے ضرور تھے لیکن اس طرح اجنبی شہر میں ان کو بیچنا بھی ایک مرحلہ تھا۔ درختوں کے جھنڈ سے کچھ آگے چھوٹے موٹے کھانے کے ہوٹل اسے نظر آئے۔ اس نے کار ایک گھنے درخت کے نیچے روک دی۔ وہ دونوں کار سے اتر آئے تھے۔ دونوں کو بھوک لگ رہی تھی۔ وہ اپنی بھوک اور جیب کے پیسوں میں توازن کر رہے تھے، تب ہی ایک لمبا چوڑا گھنی مونچھوں والا

آدمی جو اگربتی بیچنے والے ٹھیلے کے پاس چہل قدمی کر رہا تھا،ان کے پاس آ گیا۔

آپ لوگ کویت سے آئے ہیں،اس نے سیدھا سوال داغ دیا۔شاید اس نے کار کی نمبر پلیٹ دیکھ لی تھی۔

جی ہاں،کلام نے مختصر جواب دیا۔پھر اس کی نظریں پاس کے ہوٹل کی طرف اٹھ گئیں۔میرا نام ماجد ہے،ماجد کمال۔اس نے اپنا تعارف کرایا۔میں یہاں قریب ہی رہتا ہوں،اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں تو بتایئے۔کلام اس سے زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔نئی جگہ،کسی اجنبی سے ایسی بے تکلفی۔نہیں ،شکریہ کہہ کر اس نے ناہید سے کہا،چلو سامنے والے ہوٹل میں کھانا کھالیا جائے۔

چلئے،آپ میرے مہمان ہیں۔دیو بیکل ماجد کمال بولا۔میرے گھر میں کھانا کھا لیجئے۔گھر میں میری فیملی ہے،بیوی بچے، والدہ۔کلام تھوڑی دیر سوچ میں پڑ گیا۔اپنی بھوک اور جیب کے عدم توازن نے اسے کچھ اور سوچنے پر مجبور کر دیا۔

کیسے خلوص سے کہہ رہا ہے،میرا خیال ہے ہمیں اس کی آفر قبول کر لینی چاہئے،اس نے ناہید کی طرف دیکھا۔ناہید کی آنکھوں میں انکار ہی انکار تھا۔جی شکریہ،کلام میں ہمت پیدا ہوئی،دراصل ہم لوگ بہت تھک گئے ہیں،یہیں ہوٹل میں کھانا کھا کر آرام کرنا چاہیں گے۔کلام ناہید کو لے کر ہوٹل کی طرف چل پڑا۔دونوں ہوٹل میں داخل ہوئے،معمولی سا ہوٹل لیکن صاف ستھرا۔کلام نے دیکھا،وہی شخص جس نے اپنا نام ماجد بتایا تھا ،ہوٹل کے مالک سے بات کر رہا ہے۔یہ کیوں ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے،ناہید کو تشویش ہو رہی تھی۔کھانا کھا کر جب کلام بل دینے کاؤنٹر پر گیا تو مالک نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔پیسے تو ماجد بھائی بھی دے رہے تھے،وہ بولا،لیکن میں نے ان سے بھی نہیں لئے،آپ لوگ اتنی دور سے پریشانیاں اٹھاتے یہاں پہنچے ہیں ۔کلام کے بے حد اصرار کے باوجود ہوٹل مالک نے کھانے کے پیسے نہیں لئے۔اب ماجد دوبارہ ان کے پاس آ گیا تھا۔آپ لوگوں کا کیا پروگرام ہے،وہ قدرے نرم لہجے میں بات کر رہا تھا ۔جی ہم لوگ اب رات میں سفر نہیں کرنا چاہتے،یہیں کار میں صبح تک آرام کریں گے،ہمیں ڈھاکہ جانا ہے،بہار،بنگال،سب کراس کرتے ہوئے۔پتہ نہیں کیوں کلام کو اس زبردستی کے میزبان پر بھروسہ ہونے لگا تھا۔ماجد کو اس نے اپنا پروگرام بتا دیا تھا۔اس نے سوچا،اچھا انسان ہے تب ہی کھانے کے پیسے دے رہا ہے۔کار میں آپ کو گرمی لگے گی،ماجد نے پھر سرگوشی کی۔نہیں ،موسم زیادہ گرم نہیں،ہوا میں خنکی ضرور ہے لیکن کار کے شیشے کھول کر آرام کیا جا سکتا ہے۔تب مچھر آپ کو سونے نہیں دیں گے، آپ میرے گھر چلیں۔اس نے ایک بار پھر کہا لیکن کلام اس کے ساتھ جانے کو راضی نہیں ہوا۔اچھا،آپ کی مرضی آپ یہیں کار میں سوئیں،لیکن اگر آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو اسی ہوٹل سے پوری کریں۔ناہید کو محسوس ہوا کہ وہ بار بار اس کے جھمکوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔وہ کچھ دیر سستانے کو دوبارہ اس ہوٹل میں بیٹھ گئے۔اب کی بار ماجد نے چائے کا آرڈر دیا ڈھیر وہ ہوٹل کے مالک سے بولا،پنڈت جی کھانا آپ کی طرف سے ہو گیا اور چائے میری طرف سے،اور پنڈت جی مسکرا کر بولے،بہت اچھا ماجد بھائی۔چائے آ گئی،ماجد اب باقاعدہ ناہید کے جھمکوں کی طرف دیکھ رہا تھا،اس کی چور نظروں کو کلام نے بھی محسوس کیا۔اس طرح جھمکے پہن کر سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے،ماجد انہیں کہہ رہا تھا،ان علاقوں میں آوارہ لڑکے گھومتے رہتے ہیں جن کا ذریعہ معاش ان ہی علاقوں میں رہزنی کی وارداتیں ہیں،آپ انہیں اتار کر کار میں کہیں رکھ دیں۔مجھے تو اس وقت تم ہی سے خطرہ لگ رہا ہے،ناہید من ہی من میں بڑبڑائی۔کلام سوچنے لگا ڈھاکہ پہنچنے کے لئے ان جھمکوں کا بیچا جانا ضروری ہے،کیوں نہ ماجد ہی سے اس سلسلے میں بات کی جائے۔ہم ان جھمکوں کو بیچنا چاہتے ہیں،ہمیں ڈھاکہ پہنچنے کے لئے کچھ کیش کی ضرورت ہو گی۔ماجد نے مدعا بیان کر دیا۔اتنے قیمتی جھمکے،آپ انہیں کیوں بیچنا چاہتے ہیں،آپ کو کتنا روپیہ چاہئے۔چار پانچ ہزار،کلام نے جواب دیا۔لایئے جھمکے مجھے دکھایئے۔کلام نے ناہید کی طرف دیکھا اور ناہید نے جھمکے اتار کر ماجد کی طرف بڑھا دیئے۔ماجد جھمکے ہاتھ میں لے کر ان کے وزن کا اندازہ کرنے لگا۔میں یہ جھمکے آپ سے چار ہزار میں خرید سکتا ہوں،اگر آپ بیچنا چاہیں۔کلام نے سوچا،یہ تو بہت کم ہیں لیکن اس وقت کھڑے کھڑے چار ہزار مل رہے ہیں وہ آسانی سے ڈھاکہ پہنچ سکتے ہیں،یہ وقت نفع نقصان کا نہیں ضرورت کا ہے ٹھیک ہے،اس نے ماجد سے کہا،آپ چار ہزار دے دیجئے۔ماجد وہاں سے چل پڑا۔کم سے کم دس ہزار کے ہوں گے ،یہ شخص کتنی بے ایمانی کر رہا ہے،شاید مجبوری سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ناہید بولی۔کوئی زبردستی تو نہیں کر رہا،ہم نہ چاہیں تو وہ کیسے خریدے گا،کلام نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔کچھ دیر بعد ماجد رقم لیکر آ گیا،اس نے ہزار ہزار کے چار نوٹ کلام کی ہتھیلی پر رکھے اور جھمکے لیکر چلا گیا۔

دونوں رات بھر کار میں سوتے جاگتے رہے۔صبح کے پانچ بجے تو کلام نے وہاں سے روانگی کے لئے کار اسٹارٹ کی۔وہ درختوں کے جھنڈ سے نکل کر سڑک پر آیا ہی تھا کہ اسے لگا جیسے کوئی اس کی گاڑی کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔کلام نے کار روک دی۔اس نے ماجد کو پہچان لیا تھا۔میں نے سوچا،جانے سے پہلے آپ لوگوں سے مل لیا جائے۔یہ لیجئے لکھنؤ کی سوغات،اس میں لکھنؤ کی ٹکیاں ہیں۔اس نے ایک پیکٹ کلام کی جانب بڑھا دیا۔بہت شکریہ،اس کی کیا ضرورت تھی۔کلام نے پیکٹ پکڑتے ہوئے کہا ۔راستے میں کہیں بھوک لگے تو کھا لیجئے گا،آپ کو دور دور تک کوئی ریسٹورنٹ نہیں ملے گا،ماجد نے خدا حافظ کہا اور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔یہ لکھنؤ والے میری سمجھ میں نہیں آئے۔کلام نے کار سڑک پر دوڑا دی۔میرے جھمکے اونے پونے خرید لئے ،پھر بھی آپ کو لکھنؤ والوں کی سمجھ نہیں آئی۔ناہید کے لہجے میں قدرے طنز تھا۔

کلام کو ڈرائیو کرتے چار پانچ گھنٹے گزر گئے تھے،وہ لکھنؤ سے کافی دور نکل آئے تھے۔کلام کو بھوک لگ رہی تھی لیکن سڑک کے چاروں طرف بیابان،دفعتاً اسے لکھنؤ کی ٹکیاں یاد آ گئیں۔ذرا ماجد والا پیکٹ تو کھولو،میرا خیال ہے لکھنؤ کی ٹکیاں کھائی جا سکتی ہیں،مجھے بھوک کا احساس بھی ہو رہا ہے،کلام نے ناہید سے کہا ۔ناہید نے ہاتھ بڑھا کر پچھلی سیٹ پر رکھا پیکٹ کھول دیا۔اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ سی نکل گئی۔ارے کلام دیکھو یہ کیا،کلام نے ناہید کے ہاتھ میں کھلے پیکٹ کی طرف دیکھا۔لکھنؤ کی ٹکیوں کے اوپر ناہید کے دونوں جھمکے چمک رہے تھے۔